اللہ کے نام سے جو مہربان اور رحیم ہے

کتاب بہترین ساتھی ہے، اس کی حفاظت کیجئے

ISBN: 978-969-7430-24-6

زیرِ مطالعہ کتاب شاعر افتخار شاہدؔ کے ایما پر شائع کی گئی ہے اور اس کے جملہ حقوق اور ذمہ داری انہی کو مستحسن ہے۔ ادارہ اردو سخن ڈاٹ کام کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ قارئین تک بہترین اور اغلاط سے پاک ادبی مواد پہنچایا جائے اور اس ضمن میں ہر امکانی کوشش کو بروئے کار لایا جاتا ہے تاہم غلطی کی نشاندہی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے تاکہ آئندہ اشاعت میں اس کی درستی کی جائے۔

(ادارہ)

اردو شعری مجموعہ

نہیں

افتخار شاہد آبو سعد

urdusukhan@urdusukhan.com www.urdusukhan.com

اردو سخن

آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون: 0302-7844094

اسٹاکسٹ: ادارہ فکر و دانش، الحمد پلازہ، اردو بازار لاہور

نہیں

افتخار شاہدؔ ابوسعد
> 8/591۔محلہ موتی مسجد۔ڈسکہ ضلع سیالکوٹ
> کینال ویوٹاؤن۔ڈسکہ ضلع سیالکوٹ
موبائل: 8644566 300 92+
ای میل: iftikhardsk@hotmail.com

اُردو سخن>>>

استحقاق: تمام تصرفات ''افتخار شاہدؔ ابوسعد'' کی تحویل میں ہیں
ناشر: اردو سخن ڈاٹ کام، پاکستان
نمودِ دوم: جنوری 2021ء

کمپوزنگ : حسن افتخار۔ڈسکہ
سرورق: ناصر ملک
طباعت: شیرِ ربانی پریس، ملتان
قیمت: 400 روپے (20 یورو، 25 ڈالر)

urdusukhan@urdusukhan.com www.urdusukhan.com

اردو سخن

آرٹ لینڈ، گرلز کالج روڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ) فون: 0302-7844094
اسٹاکسٹ: ادارہ فکر و دانش، الحمد پلازہ، اردو بازار لاہور

اِنتساب

اپنی شریکِ حیات

کے

نام!

فہرست

مضامین:

غنچہء نفسیات نکھارتا ہوا افتخار شاہدؔ	گُلِ رابیل	10
اقرا باسم ربک الذی خلق	افتخار شاہد ابو سعد	13

گل ہائے عقیدت:

رنگ خوشبو ہوا ترا پرتو	حمد باری تعالیٰ	16
میں یہاں ہوں گماں مدینے میں	نعت رسول مقبولؐ	18
راہِ وفا میں سر کو کٹایا حسین نے	سلامِ حسینؑ	20

غزلیات:

بچھڑنے والے تمہیں بھی ملال ہے کہ نہیں	22
نکلا کہیں پہ کوئی ستارہ، نہیں نہیں	23
وہ اپنے دشت ذات میں تو چپ کبھی رہا نہیں	25
کس کی پنڈلی کھلی ہے بارش میں	27
حوصلہ باندھ کر، بجائے پر	29
تیرگی کو مٹانے والا ہوں	30
اس بہانے یا اس بہانے سے	33
آپ کے اِصرار پر رکھا گیا	35
اک دیگچی میں آج بھی پتھر ابال کر	37
خواب تعبیر ہو نہیں سکتا	39
رنج تیرے ملال سے پہلے	41
اب تو یہ ہجر تماشہ نہیں دیکھا جاتا	43
آخری امتحان سے پہلے	45
امید کا اک پھول جو خوابوں میں کھلا تھا	47

یہاں پہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اور کچھ ہے 49
ایک دو گیت سناتے ہیں چلے جاتے ہیں 50
پہلے اُس نام کا کلمہ تو پڑھا یا جائے 51
گھنگھور گھٹائیں تھیں بڑی تیز جھڑی تھی 53
گھونسلے والا شجر اور شاخچہ معلوم ہے 54
نگاہِ یار سے نسبت بہت ضروری ہے 56
جستجو شوق کے غنچوں کو کِھلا سکتی ہے 58
تِرے، میرا خدا ہونے سے پہلے 60
اپنے بچوں کی طرح شوق سے پالے میں نے 62
بام و در پہ جڑی اداسی ہے 64
ہم صَد ہزار بار تجھے دیکھتے رہے 66
یاروں نے میرے واسطے کیا کیا نہیں کِیا 67
آنکھ سے آنکھ جب ملی ہوگی 68
تارے فلک سے توڑ کے لائے ابھی نہیں 70
اور کچھ بھی نہیں رہا باقی 72
پھولوں سے رنگ، رنگ سے خوشبو کشید کی 74
نامکمل ہی سہی پھر بھی کہانی سمجھو 75
اگرچہ آنکھ مری اشکباریوں بھی ہے 76
تجھ کو پورا نہیں ملا ہوں میں 78
گوش بَر دیوار ہے 80
یہ ٹھیک ہے کہ محبت سزا بھی دیتی ہے 82
وداعی بوسہ جبیں پہ رقم کیا جائے 84
عشق ناکام ہو گیا تو پھر 86
بیقراری سی بیقراری ہے 88

حُسن کی سرکار تیرا شکریہ 90
کالی رُتوں کے زخم جو کھائے ہیں دوستو 92
آنکھ کے جھپکنے میں دیر کتنی لگتی ہے 94
فاصلہ دو کمان تھا ہی نہیں 95
اس کا چہرہ گیسوؤں کی زد میں ہے 96
پہلے تو بے شمار سنوارا گیا مجھے 98
پہلے پہل تو صرف خسارا کیا گیا 99
سرِ محفل صدائے دل سنا کر دیکھ لیتے ہیں 100
اندھیرے میں برابر بولتا ہوں 101
آئینوں کو پرے ہٹا دیجے 102
صد مے ہزار جان پر ہنستے ہوئے سہے 104
کسی کو اپنا بنانے کی بات کی ہم نے 106
زندگی سے اور ہو کتنی لڑائی معذرت 107
دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے 108
کوئی منظر بھلا نہیں لگتا 110
آندھیوں نے بجھا دیا ہے دیا 112
عنوان بے مثال روانی غضب کی ہے 114
مُسکرانے میں کیا قباحت تھی 116
اپنی پہچان یوں کرا لیں گے 118
دنیا بڑی خراب ہے میں نے کہا تو تھا 120
وہ صبح رات کے دامن سے جب نکل آئی 122
وقت کو یوں کڑی سزا دیتا 123
درد آزار سے پرے کچھ ہے 124
مُردار رواجوں کے ٹھٹھرتے ہوئے سائے 127

دوستو یہ اٹھان ٹھیک نہیں 128
بجھنے لگے سراب 130
دل زیادہ دھڑک رہا ہے میاں 132
خواب در خواب جھانکتی ہے ابھی 134
ہماری اَور بھی اب ان کا دھیان آیا ہے 136
کچے گھڑے پہ پار جو جانا پڑا مجھے 138
یاروں کو تو اس بات کا ادراک نہیں ہے 140
کومل کومل جذبوں کی توہین ہوئی ہے 141
درد میرے ضبط سے کچھ کچھ سوا پہلے بھی تھا 142
کچھ اور بھی ظلمت کو بڑھا کیوں نہیں دیتے 144
گلشن میں ہیں اب سرو و سمن اور طرح کے 145
شکوے گلے کو یار مٹانے کی بات کر 146
آپ گُلشن میں جب گئے ہوں گے 148
ڈوبتے چاند کچھ بتا اُن کا 150
چراغِ شب ہوں کسی لو سے ملنے والا ہوں 152
ناخدا کا ہے کچھ سہارا بھی 154
بھٹک نہ جائے کہیں کاروان رستے میں 156
دیکھ کے تیری چال روانی بھول گیا 157
ستارے بامِ فلک سے اُتر کے دیکھتے ہیں 158
یوں تو ہر چیز آنی جانی ہے 160
پھول کانٹے اور سارے شاخچے اچھے لگے 162
سر پہ دھر دستِ دعا دوست مجھے جانے دے 164
تصویرِ یار ہم نے جلانی تو ہے نہیں 166
حسنِ بیداد گر سلیقے سے 167

غنچہء نفسیات نکھارتا ہوا افتخار شاہدؔ

شعور سے دیکھا جائے یا شوق سے، عام منظر بھی عظیم تر نظر آتا ہے۔ کردار لفظوں سے تصویر بناتے ہیں اور لفظ مصرعوں کا روپ دھار کر غزل کو جمالیاتی روپ عطا کرتے ہیں۔

دو صدیوں سے سنتے آرہے ہیں کہ آتے ہیں غیب سے مضامین خیال میں لیکن یہاں ''نہیں'' کے خالق افتخار شاہد ہیں جن کا اپنا ہی شعری اسلوب ہے۔ معیشت دان ہونے کے باوجود ادب نگری میں اپنے منفرد رنگ اور ممتاز ادبی حیثیت کے ساتھ پورے قد سے کھڑے ہیں۔

ان کی تخلیق سے وجود پانے والے الفاظ کا اپنے معانی کے ساتھ ربط وضبط نئے نئے مضامین کو جنم دیتا ہے

افتخار شاہد کے قلب پر نازل ہونے والے مضامین درحقیقت کسی جزو کی اپنے کل کے ساتھ وابستگی کا خوبصورت اظہار ہے کہ افتخار کی غزل روشنی کی سفیر ہے۔ افتخار شاہدؔ کے مصرعے اماوس راتوں میں جگنو بن کر جگمگاتے ہیں۔

قارئین! آپ افتخار شاہد کی تخلیقات کا مطالعہ کریں تو آپ پر یہ راز ضرور کھلے گا کہ افتخار شاہد کے لفظ فہم وشعور کے متلاشی کے لیے رزق کیوں کر بنتے ہیں؟

کیسے افتخار شاہدؔ اپنے قاری وسامع کو تصور اور خیال کے براق پر سوار کرتا ہے؟

مادے سے روح کی جانب ہوتا ہوا یہ سفر انتہائی دلفریب و دلنشیں ہے۔

افتخار شاہد کی غزلیں گلدستہء درد ہیں اور جذبات کا سیل رواں بھی ہیں۔ مزاحمت کا کوہِ گراں بھی ہیں، کتابِ احساسات کی بیاض بھی ہیں اور خالص اور کومل شاعری کا سرچشمہ بھی۔

افتخار شاہد کی زنبیلِ ادب میں تلخیاں، آنسو اور آہیں بھی ہیں اور افلاطونی عشق کا اظہار بھی ہے۔ موسیقیت بھی ہے، بصارت اور بصیرت بھی۔

میں سمجھتی ہوں کہ افتخار شاہدؔ کا کلام جہاں اپنے قارئین کے فکری حسن کو سنوارتا ہے، وہیں غنچہء نفسیات کو بھی نکھارتا ہے۔

''نہیں'' میں شامل غزلوں کا رنگ و آہنگ ایک روایت سے منسلک ہوتے ہوئے بھی روایت شکن معلوم ہوتا ہے۔ محبت و الفت اور اس کائناتِ محبت میں گزرنے والی راحتوں اور قیامتوں کو جس انداز میں افتخار شاہدؔ نے لفظوں کا پیراہن عطا کیا اور دلفریب استعاروں میں ڈھالا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں کہ افتخار شاہدؔ نے ایثار، خلوص اور محبت کے نرم و لطیف جذبات کے سانچے میں ڈھال کر ''نہیں'' کی صورت احساس و خیال کی رنگین دنیا بسائی ہے اور اس دنیا میں ہم سب کو شامل کر لیا ہے تا کہ ہم بھی افتخار شاہدؔ کے تجربات و مشاہدات، فکری بلوغت اور شعوری جد و جہد کا حصہ بن سکیں۔

افتخار شاہدؔ کی شاعری ان کی زندگی کے تجربات، احساسات، مشاہدات اور محسوسات کا نچوڑ ہے۔ زندگی کے رنگ خواہ طربیہ ہوں یا المیہ، انہوں نے بڑے سلیقے اور قرینے سے انہیں اپنی تخلیقات میں سمو دیا ہے۔

افتخار شاہدؔ کیا ہیں؟ لفظوں کا گلستان جس میں حکمت و دانائی اور شعور کے رنگا رنگ پھول مہک رہے ہیں۔ کہیں تدبر و فکر کے سرسبز و شاداب درخت جھوم رہے ہیں تو کہیں عزم و یقیں کے خوش الحان پرندے محو پرواز ہیں۔

افتخار شاہدؔ کی فکر اپنے اندر دل بستگی کا سامان بھی رکھتی ہے اور کیف و وجد کی شان بھی۔

مہذب جذبات، متوازن احساسات اور نادر موضوعات پر مبنی اشعار اپنے ظاہر و باطن میں یکساں خوبصورت اور دلکش ہیں۔

افتخار شاہدؔ خود ایک مکمل دیوان ہیں۔ انہوں نے محبت، رومان، عشق، امن دوستی، انسانی

رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، جنگ وجدال، حساسیت اور انسانیت سمیت کائنات کے ہر پہلو کو موضوع سخن بنایا ہے۔ افتخار شاہدؔ کی ڈکشن اور اسلوب اپنا ہے۔ کہیں بھی، کسی بھی مصرع میں عامیانہ پن یا سطحیت نہیں ملتی۔

ان کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اتارے گئے ہیں مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے انہیں ایسی شان وشوکت سے کرسیوں پر بٹھایا کہ پہلے سے بھی اونچی سطح پر نظر آتے ہیں۔ انہیں قادر الکلامی کے دربار سے بادشاہِ سخن کی سند مل گئی ہے۔ ہر قسم کے خیال کو، جس رنگ سے چاہتے ہیں، کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر اور کبھی استعارہ کی مہک میں بساتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی بالکل سادہ لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں۔ مگر ہر دفعہ کچھ ایسا کہہ جاتے ہیں کہ دل میں نشتر سا چبھ جاتا ہے اور منہ سے کبھی واہ نکلتے نکلتے آہ نکلتی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کے کلام کے لبوں سے شستہ اور برجستہ لفظوں کے خزانے برستے جاتے ہیں، تراکیب و لفاظی کے ہزاروں رنگ ہیں، جسے جہاں سجتا دیکھتے ہیں، وہ گویا اسی کے لیے بنا ہوتا ہے۔ آپ کے ہاں مشکل ترین مضامین بھی بڑے سیدھے اور سادہ انداز میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔

''نہیں'' کے مطالعہ سے صاحبِ کتاب کی شاعری میں شوخیء اندیشہ، رفعت، فکری احساس، فنی بلوغت اور عصرِ حاضر کا شعور توانا نظر آتا ہے۔ کلام میں جگہ جگہ وقت کے تقاضوں کا جو ادراک، فکر ونظر کی روشنی میں اشارات وعلامات کے ذریعے ہوا، وہ آج کل کے ادب میں اب خال خال ہی دکھائی دیتا ہے۔ الفاظ کی دلکش نشست و برخاست، پرکیف روانی اور اظہار و بیان میں جو ندرت دیکھنے میں آئی ہے، وہ فراست اور زاویہءفکر ونگاہ افتخار شاہدؔ کا تعارف بنے گا کہ ان کی تخلیق میں رعنائیء خیال اور لطافتِ انکار کی چاشنی باہم گلے ملتی اور بوس وکنار کرتی نظر آتی ہے جو مجھ ایسی کم فہم کے لیے کسی نشاطِ حیرت سے کم نہیں۔

آیئے! مجموعہء کلام کی دعوتِ مطالعہ ہے، اس امید اور یقین کے ساتھ کہ آپ احباب سند قبولیت بخشیں گے۔

دعا گو:

گُلِ رابیل

اقرا باسم ربک الذی خلق

اُمنگیں اور آرزوئیں ہر دل میں پیدا ہوتی ہیں، جذبوں کے خوشنما پھول دل کی ہر کھیتی پر اپنے رنگ نچھاور کرتے ہیں، احساسات کی کلیاں ہر دل کی شاخ پر اپنا جوبن دکھاتی ہیں، خوشی اور غم کے تاثرات ہر شخص کو یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں، ہر آنکھ چمکتی ہے اور ہر دل کی دھڑکن لرزاں ہوتی ہے۔

زندگی کے ساز پر ہر دل رقص کناں ہوتا ہے۔

لیکن محسوسات کو لفظوں، مصرعوں یا شعروں کا لبادہ پہنانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی اور نہی ہی ہر شخص درد کی تصویر کشی پر قادر ہوتا ہے۔

زبان و بیان اور اظہارِ مدعا کا سلیقہ سب کو حاصل نہیں ہوتا۔

جس طرح زورِ خطابت کا وصف ہر شخص کے نصیب میں نہیں ہوتا، اسی طرح شاعری کی دیوی ہر کسی کے در پر جبہ سائی نہیں کرتی۔

یہ عطیہء خداوندی ہے جو چیدہ چیدہ شخصیات کو ودیعت کیا جاتا ہے۔ اس ہنر کو وہ مشق اور فنی ریاضت کے ذریعے تاعمر نکھارتا رہتا ہے۔

حرفوں، لفظوں، تحریروں اور کتابوں کے ساتھ میرے عشق کی داستان بہت پرانی ہے۔ میں

اگر یہ کہوں کہ یہ عشق میری پوری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے، تو قطعی طور پر بے جا نہ ہوگا۔ سکول کے ابتدائی دنوں سے ہی کاغذ اور کتاب کے ساتھ میرا رشتہ اس طرح جڑا کہ باقی ہر چیز ثانوی حیثیت اختیار کر گئی۔

میرا تعلق ادب کی تقریباً تمام اصناف کے ساتھ مختلف ادوار میں استوار رہا لیکن شاعری کی دوشیزہ نے ذہن و دل کو اپنی زلفوں کے جال میں ایسا جکڑا کہ میں انہی بھول بھلیوں میں اپنی زندگی کی روشنیاں تلاش کرتا رہا اور سفر کی منزلیں طے کرتا رہا۔ شاعری نے مجھے متاثر بھی کیا اور مہمیز بھی۔ مجھے گمان گزرتا ہے کہ اگر میں شعر نہ کہہ رہا ہوتا تو شاید اب تک میں مر گیا ہوتا۔

یہ نہ ہوتی تو مر گیا ہوتا
شاعری خون کی روانی ہے

شاعری نے مجھے جینے کا سلیقہ اور مرنے کا حوصلہ عطا کیا۔ حرص و ہوس اور خود غرضی کے مٹیالے اندھیروں میں شاعری ایک تابناک سورج بن کر آسمانِ زندگی پر ضوفگن رہی۔

اس سے پہلے میری شاعری پر مشتمل تین کتابیں شائع ہو کر اربابِ فن سے ستائش حاصل کر چکی ہیں۔ ''نہیں'' میری چوتھی کتاب ہے جو عنقریب میرے مہربانوں اور کرم فرماؤں کے ہاتھ میں ہوگی۔

''نہیں'' ہاں کا استعارہ ہے جس طرح نفی اثبات کا دروازہ ہے، عدم وجود کی دلیل ہے اور تاریکی روشنی کا ثبوت ہے۔ گویا اس کائنات کی بنیاد ''نہیں'' ہے۔ بحیثیت مسلمان ہمارا کلمہ ''لا'' (نہیں) سے شروع ہوتا ہے اور انسان کو اپنے جلو میں لیے ایمان کی پرنور وادیوں میں پہنچا دیتا ہے۔

میرے بیشتر اشعار اور غزلیں ''نہیں'' کی گردان کرتے ہیں۔ بزعمِ خود میں نے ''نہیں'' کے وجود سے ہاں کے امکانات تلاش کرنے کی جستجو کی ہے۔ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ قارئین کریں گے۔

آخر میں مَیں اپنے اللہ کے حضور تشکر کے جذبات پیش کرتا ہوں جس نے انسان کو پڑھنا

سکھایا اور قلم کے ذریعے علم عطا کیا۔اس کی توفیق سے شعروسخن کی دیوی مجھ پر ہمیشہ مہربان رہی اور میرے ہونے کی دلیل اور جواز بنتی رہی۔

شکریہ اے خدائے شعروسخن
تُو نے تو بات ہی بنا دی ہے

افتخار شاہد ابوسعد
ڈسکہ (پنجاب)
دسمبر 2020ء

حمد باری تعالیٰ

رنگ خوشبو ہوا ترا پرتو
پھول غنچے صبا ترا پرتو

دھوپ چھاؤں سے تو جھلکتا ہے
یعنی سورج گھٹا ترا پرتو

آنکھ تیری ہے کان تیرے ہیں
جو بھی دیکھا، سنا ترا پرتو

یہ تری ذات کے حوالے ہیں
چاند ، جگنو ، دیا ترا پرتو

حسن شیریں سخن ترا سایہ
حسن کافر ادا ترا پرتو

عالمِ شوق ہے کرم ترا
شوق کی انتہا ترا پرتو

مظہرِ کبریائی ہے شاہدؔ
وقت چلتا ہوا ترا پرتو

نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

میں یہاں ہوں گماں مدینے میں
جسم ڈسکہ ہے جاں مدینے میں

کیا گھڑی تھی کہ جس گھڑی پہنچا
آپ کا کارواں مدینے میں

آپ کے گھر سے مُتّصِل ہوتا
کاش ہوتا مکاں مدینے میں

بن کے منگتے غرور کرتے ہیں
بادشاہ بھی یہاں مدینے میں

یاد آئی بلالِ حبشی کی
جب بھی گونجی اذاں مدینے میں

رنگوں نسلوں کے ٹوٹ جاتے ہیں
سارے فخر و گماں مدینے میں

نعت کہتے ہوئے میں مٹ جاؤں
ختم ہو داستاں مدینے میں

ہائے قسمت کہ چھوڑ آیا ہوں
مسکراتا جہاں مدینے میں

خاک میں مل کے خاک ہو شاہدؔ
یہ مرا خاکداں مدینے میں

سلام حسینؑ

راہِ وفا میں سر کو کٹایا حسین نے
بُجھ نہ سکے جو دیپ جلایا حسین نے

خُطبہ دیا جو آپ نے، حجت تمام کی
اپنا مقام یاد دلایا حسین نے

کربل کی سرزمیں پہ بہتر کٹا دیئے
سر نہ کسی بھی طور جُھکایا حسین نے

حُرمت بچائی آپ نے نانا کے دین کی
سکہ جہاں میں اپنا چلایا حسین نے

ظُلمت کدے تو مٹ گئے دو چار سال میں
لیکن جو کربلا میں کمایا حسین نے

قدموں میں چاند اور ستارے بھی آ گرے
سورج سے بڑھ کے ہاتھ ملایا حسین نے

بچھڑنے والے تمہیں بھی ملال ہے کہ نہیں
تمہارے دل میں بھی میرا خیال ہے کہ نہیں

اگر میں قامتِ زیبا کا کھینچ دوں نقشہ
بتا یہ میرے ہُنر کا کمال ہے کہ نہیں

تمہارے عارض و گیسو تو خوب ہیں لیکن
دل و نظر میں بھی حُسن و جمال ہے کہ نہیں

طلب کا کوئی سلیقہ نہیں مگر آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
ترا غلام سراپا سوال ہے کہ نہیں

دیارِ حُسن کی رونق تو ماند ہے شاہدؔ
سراجِ شوق تجھے بھی زوال ہے کہ نہیں

نکلا کہیں پہ کوئی ستارہ ، نہیں نہیں
بام فلک سے کوئی پکارا ، نہیں نہیں

بادہ کشو ہے آج کیوں مستی عروج پر
چشمِ فسُوں کا کوئی اشارہ نہیں نہیں

دریائے غم میں یاد کے آوارہ قافلو
کیا ڈھونڈتے ہو کوئی کنارہ نہیں نہیں

دیدہ وروں کی آنکھ میں حیرت کا یہ سماں
رخ سے نقاب اس نے اتارا، نہیں نہیں

دیوانگانِ راہِ محبت ، ذرا کہو
اس کھیل میں ہے سارا خسارہ ،نہیں نہیں

ہم پُرسشِ احوال پر اتنا ہی کہہ سکے
ہوتا تیرے بغیر گزارا نھیں نہیں

سینہ فلک کا چیر کے آتی ہے یہ صدا
بھیجوں کوئی عذاب، دوبارہ نہیں نہیں

وہ اپنے دشتِ ذات میں تو چپ کبھی رہا نہیں
تمہاری بزمِ ناز میں جو آج لب کُشا نہیں

جمالِ تابناک کے وہ تزکرے کدھر گئے
نگاہِ شرمگیں کا ذکر اب کبھی ہوا نہیں

تجلّیاں وہ نور کی نہ جانے کھو گئی کہاں
رہینِ شوقِ امتحاں کہیں کوئی بچا نہیں

تمام لوگ ایسی ویسی اُلجھنوں میں پڑ گئے
کسی زباں سے تذکرہ بہار کا سُنا نہیں

میں سبز رنگ کی تتلیوں کو ڈھونڈتا ہی رہ گیا
تمہارے گھر کے سامنے جو باغ تھا، ہرا نہیں

کہیں پہ اک چراغ بھی جلا ہوا نہیں ملا
تو یوں کہو کہ رات سے کسی کو بھی گلہ نہیں

نہ جانے کس لئے دیے کی لو ٹھٹھر ٹھٹھر گئی
تمہارے آتشیں لبوں کا ذکر تو ہوا نہیں

کس کی پنڈلی کھلی ہے بارش میں
آگ لگنے لگی ہے بارش میں

رنگ اڑنے لگے گھٹاؤں کے
زلف تیری کھلی ہے بارش میں

کون کھڑکی میں آ کے بیٹھا ہے
کتنی روشن گلی ہے بارش میں

زلف بھیگی ہے کس حسینہ کی
جس کی خوشبو گھلی ہے بارش میں

جیسے پانی نہیں یہ موتی ہیں
جیسے چاندی ڈھلی ہے بارش میں

ایک مورت کو بھیگتے دیکھا
دل پہ بجلی گری ہے بارش میں

رنگ تو خیر ، جاں جائے گی
یہ جو تتلی اڑی ہے بارش میں

اک اداسی جو مجھ پہ طاری تھی
اور بڑھنے لگی ہے بارش میں

اتنی اچھی لگی اسے بارش
اس کی چھتری پڑی ہے بارش میں

حوصلہ باندھ کر ، بجائے پر
جا رہا ہوں فلک سرائے پر

مجھ کو اڑنے کی آرزو ہے مگر
میں نے مانگے نہیں پرائے پر

خوش خصالوں کی خاص بستی میں
مل بھی سکتا ہے گھر کرائے پر

اس سے کہہ دو کہ اب اڑان بھرے
اس سے کہہ دو کہ آزمائے پر

اک پرندے کی بے بسی دیکھی
میں نے کاغذ پہ پھر بنائے پر

میں نے سورج بجھا دیا شاہدؔ
دھوپ مرنے لگی تھی سائے پر

تیرگی کو مٹانے والا ہوں
میں ستارے اگانے والا ہوں

میرے اندر الاؤ کتنے ہیں
روشنی کو بتانے والا ہوں

تم تو مالی ہو پھول توڑو گے
میں تو پودے لگانے والا ہوں

دشتِ وحشت سلام کر مجھ کو
تیری حرمت بڑھانے والا ہوں

لوگ حیرت سے دیکھتے ہیں مجھے
آنے والا کہ جانے والا ہوں

تم تو پتھر کے آدمی ہو میاں
میں تو کوزے بنانے والا ہوں

فاختاؤں کی خیر ہو مولا
فاختائیں اڑانے والا ہوں

میں وہ مومن کہ ایک ہی دھوکا
دوسری بار کھانے والا ہوں

پہلے منظر بنا رہا تھا میں
اب میں آنکھیں بنانے والا ہوں

نکتہ چیں ہوں مگر جو تُو سمجھے
تجھ کو اوپر اٹھانے والا ہوں

آج میں تیرے آسمانوں کو
اس زمیں سے ملانے والا ہوں

دیکھ اپنی انا کے پنجرے سے
کچھ پرندے اڑانے والا ہوں

دشتِ وحشت مگر ، میسر ہے
کچھ دنوں سے ٹھکانے والا ہوں

روشنی زرد پڑنے والی ہے
اپنا شجرہ بتانے والا ہوں

بادبانوں کو کھولئے شاہدؔ
آخری گیت گانے والا ہوں

اس بہانے یا اس بہانے سے
تم تو لڑنے لگے زمانے سے

میں نے پہلے کمان توڑی ہے
آخری تیر کے چلانے سے

سارے کردار مجھ سے نالاں ہیں
میں نکل جاوں گا فسانے سے

آئینہ دیکھنے کی عادت ہے
جب بھی فرصت ملے زمانے سے

آخرش ہم نے معذرت کر لی
پھول سے، تتلیاں بنانے سے

چاک پر خال و خد ابھر آئے
ایک ہی بار کے گھمانے سے

آگ گھر کو ہی لگ گئی آخر
اک دیا بام پر جلانے سے

یہ تو خوشبو ہے پھیل جاتی ہے
عشق چھپتا نہیں چھپانے سے

آخرش تو فرار ہونا ہے
ہم کو دنیا کے جیل خانے سے

ایک در کے نہ جب ہوئے شاہدؔ
ہو گئے دربدر ٹھکانے سے

آپ کے اِصرار پر رکھا گیا
فیصلہ تلوار پر رکھا گیا

آندھیوں سے گفتگو کے شوق میں
اک دیا دیوار پر رکھا گیا

سر بلندی یوں ملی ہے دوستو
سرفرازِ دار پر رکھا گیا

زخم کو چارہ گری کے بعد بھی
زخم کے معیار پر رکھا گیا

آنکھ رکھی دھوپ کے رخسار پر
جسم کو پرکار پر رکھا گیا

نبض کی رفتار کوئی دیکھتا
ہاتھ جب رخسار پر رکھا گیا

دشت میں تعبیر شاہدؔ کھو گئی
خواب سبزہ زار پر رکھا گیا

اک دیگچی میں آج بھی پتھر ابال کر
رکھ لی ہیں ماں نے ساری دعائیں سنبھال کر

دھیرج کے ساتھ آنکھ سے خوابوں کو نوچئے
پلکوں کی سرزمیں ہے ذرا دیکھ بھال کر

خواہش کی تیز دھوپ نے جھلسا دیا بدن
سر پر ذرا سی دیر کو زلفوں کی شال کر

ہم رات کے خداوں سے اُلجھے ہیں دیر تک
اور لائے ہیں چراغ سے سورج نکال کر

کھولی کبھی نہ یاد کی کوئی دراز بھی
لیکن درودیوار کو رکھا اجال کر

جانے سے پیشتر مرے سینے پہ ہاتھ رکھ
دھڑکن کی التجاوں کا یارا خیال کر

یزداں بھی ایک بار تو حیرت میں پڑ گیا
حُسن و جمال آپ کے پیکر میں ڈھال کر

شاہدؔ سمے کی جھیل میں ہلچل کوئی مچے
صَوت و صدا کے دیکھیے پتھر اُچھال کر

خواب تعبیر ہو نہیں سکتا
وقت زنجیر ہو نہیں سکتا

تیرا دیدار ہو، مسلسل ہو
ورنہ اکسیر ہو نہیں سکتا

لاکھ ٹھہرے سخن سرائے میں
ہر کوئی میرؔ ہو نہیں سکتا

دل کا مندر اگر گرایا تو
پھر یہ تعمیر ہو نہیں سکتا

وہ مرے غم میں رو پڑا ہو گا
اتنا دلگیر ہو نہیں سکتا

تیری جاگیر پر ملازم ہوں
تیری جاگیر ہو نہیں سکتا

دوبدو جنگ ہو اگر شاہدؔ
تیر، شمشیر ہو نہیں سکتا

رنج تیرے ملال سے پہلے
رقص جیسے دھمال سے پہلے

وقتِ رخصت وہ آنکھ کی لالی
جیسے سورج زوال سے پہلے

زخم پھولوں سا مسکراتا تھا
آپ کی دیکھ بھال سے پہلے

لوگ تیری مثال لے آئے
یعنی میری مثال سے پہلے

بولتا کون آج محفل میں
تجھ سے شیریں مقال سے پہلے

تیری رحمت نے جھولیاں بھر دیں
میرے دستِ سوال سے پہلے

رنگ بےخانماں رہے شاہدؔ
تیرے رنگِ جمال سے پہلے

اب تو یہ ہجر تماشہ نہیں دیکھا جاتا
تری آنکھیں مرا چہرا نہیں دیکھا جاتا

جس میں رکھا ہے تری یاد کو پرزے کر کے
ہم سے وہ شیلف کا خانہ نہیں دیکھا جاتا

تری آنکھوں میں میرا عکس تو ہو گا لیکن
جھیل میں چاند کا ہالا نہیں دیکھا جاتا

ہم جو تاریک گزرگاہوں سے ہو کر آئے
ہم سے صد رنگ اجالا نہیں دیکھا جاتا

ایسی آنکھیں کہ کوئی ڈوب کے ابھرا ہی نہیں
ایسا منظر کہ دوبارہ نہیں دیکھا جاتا

اب کوئی آنکھ مکرر نہیں کھلنے والی
اب مرے ہاتھ کا چھالا نہیں دیکھا جاتا

یوں تو کربل کی زمیں پر تھے بہتر لاشے
علی اصغرؑ تیرا لاشہ نہیں دیکھا جاتا

آخری امتحان سے پہلے
رقص کیجے اڑان سے پہلے

تول کر بولنا ہی اچھا ہے
تیر تھامو کمان سے پہلے

وصل کی رات کا کوئی قصہ!
ہجر کی داستان سے پہلے

ٹوٹتے حوصلے مسافر کے
منزلوں کے نشان سے پہلے

میری نسبت تھی کچھ چراغوں سے
آپ کے خاکدان سے پہلے

ایک پھولوں کی بیل آتی ہے
میرے اجڑے مکان سے پہلے

میں تو خود چھتریاں بناتا تھا
تیرے اس سائبان سے پہلے

بعد میں تیغ آزمائی ہوئی
تیر نکلا زبان سے پہلے

خواب پلکوں پہ رقص کرتے تھے
میرے وہم و گمان سے پہلے

جل گئے بال و پر پرندوں کے
پہلے ہی آسمان سے پہلے

دوستو خاک کے برابر ہے
حسن ،حُسنِ زبان سے پہلے

اپنی تکفیر یوں ہوئی شاہدؔ
جھک گئے آستان سے پہلے

امید کا اک پھول جو خوابوں میں کھلا تھا
وہ پھول ترے پاؤں کے تلووں میں پڑا تھا

کہتے ہیں کہ خود تیر کی آنکھیں نہیں ہوتیں
لیکن وہ کسی آنکھ بھروسے پہ چلا تھا

وہ چاند جسے ڈھونڈنے ہم جھیل میں اترے
وہ چاند فلک بوس بلندی پہ اگا تھا

جلتے ہوئے خیمے نہیں امکان کے در تھے
ورنہ جو ترے شہر میں اندھیر مچا تھا

رستے میں بہت اس کے سلگتے ہوئے تھل آئے
صد شوق لئے جانبِ منزل تو چلا تھا

ہم گرمیء بازار کے منکر تو نہیں ہیں
کس مول یہاں یوسفِ کنعان بکا تھا

لوگوں کو ذرا دیر میں احساس ہوا لیکن
یاروں کو مری ذات سے پہلے ہی گلہ تھا

وہ شخص مقابل سے تو ہارا نہیں شاہدؔ
اک تیر جو پیچھے سے اُسے آ کے لگا تھا

یہاں پہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ اور کچھ ہے
مگر جو پنچوں کا فیصلہ ہے وہ اور کچھ ہے

سخن تراشو تمہاری غزلیں ہیں خوب لیکن
وہ ایک مصرعہ جو بولتا ہے وہ اور کچھ ہے

بہارِ جاں میں بدن کی شاخیں لہک رہی ہیں
مگر وہ خوشبو جو کم نما ہے وہ اور کچھ ہے

تری ریاضت کہ آج تجھ کو میں مل گیا ہوں
مری ریاضت کا جو صلہ ہے وہ اور کچھ ہے

جو آئینے سے چھلک رہا ہے وہ تو ہے شاہدؔ
جو عکس رنگوں سے ماورا ہے وہ اور کچھ ہے

ایک دو گیت سناتے ہیں چلے جاتے ہیں
یوں ترا ہجر مناتے ہیں چلے جاتے ہیں

میں نے دیکھے ہیں کئی شعبدہ گر بھی لیکن
یار جو ہاتھ دکھاتے ہیں چلے جاتے ہیں

مجھ سے بہتر ہیں اداکار کہ جوکر بن کر
رونے والوں کو ہنساتے ہیں چلے جاتے ہیں

آج کی شام کا عنوان تو ہے ''شامِ غزل''
ہم تجھے نظم سناتے ہیں چلے جاتے ہیں

اب تعلق کی یہی ایک بچی ہے صورت
دور سے ہاتھ ہلاتے ہیں چلے جاتے ہیں

تیری گلیوں کے چراغوں کو کئی روز سے ہم
شام سے پہلے جلاتے ہیں چلے جاتے ہیں

اب یہ سوچا ہے نئے چاک نئی مٹی سے
کچھ نئے لوگ بناتے ہیں چلے جاتے ہیں

اپنی اس بزمِ سماعت کی سخاوت یہ ہے
لوگ آتے ہیں سناتے ہیں چلے جاتے ہیں

حاکمِ وقت ہے اس بات پہ برہم شاہدؔ
ہم جو زنجیر ہلاتے ہیں چلے جاتے ہیں

پہلے اُس نام کا کلمہ تو پڑھایا جائے
پھر مجھے منبر و محراب دکھایا جائے

موت کے ہاتھ پہ بیعت بھی کریں گے لیکن
ہم کو جینے کا قرینہ تو سکھایا جائے

حاکمِ شہر کو قاضی نے بلا رکھا ہے
حاکمِ شہر کو انصاف دلایا جائے

تو نے غالب کو پڑھا، خوب پڑھا ہے لیکن
اب تجھے میرا کوئی شعر سنایا جائے

پھول کلیوں سے ملاقات بھی ہو گی شاہدؔ
پہلے کانٹوں سے تعارف تو کرایا جائے

گھنگھور گھٹائیں تھیں بڑی تیز جھڑی تھی
تتلی کو مگر باغ میں جانے کی پڑی تھی

کچھ ضبط کے تالے میرے ہونٹوں پہ لگے تھے
اک میخ جدائی کی جو سینے میں گڑی تھی

میں آنکھ میں بس روشنی بھرنے ہی لگا تھا
کم بخت تجھے بام پہ آنے کی پڑی تھی

دیوار کے سب عیب چھپا رکھے تھے اس نے
پھولوں کی وہ اک بیل جو دیوار چڑھی تھی

اس وقت الاؤ بھی ٹھٹھرنے لگا شاہدؔ
جس وقت کہانی کے سنانے کی گھڑی تھی

گھونسلے والا شجر اور شاخچہ معلوم ہے
سب پرندوں کو گھروں کا راستہ معلوم ہے

یوں ہجومِ عاشقاں تقلید کرتا ہے مری
جیسے مجھ کو منزلوں کا ہر پتہ معلوم ہے

کس کی خوشبو پاوں کی زنجیر بن کر رہ گئی
کس لئے ٹھہرا ہوا ہے قافلہ معلوم ہے

آسمانِ شوق کے تاروں سے جا کر پوچھنا
کس طرح کاٹا ہے ہم نے رتجگا! معلوم ہے؟

میں نے پہلے کیمیا گر کی سنی اور پھر کہا
کیا تجھے اپنا یا میرا ''ساختہ'' معلوم ہے ؟

جن کو اپنی سمت کا کوئی بھی اندازہ نہیں
ان ستاروں کو ہمارا زائچہ معلوم ہے!!!

جانے کس کے اشک پانی میں ملے ہیں دوستو
ساحلوں کو آنسوؤں کا ذائقہ معلوم ہے

میں نے اس باغِ بدن کی سیر کی ہے بارہا
اس کی ہراک قوس ہر اک زاویہ معلوم ہے

آج ساری رات شاہدؔ اشک پیتے کٹ گئی
صبح کیسی ہو گی کیسا ناشتہ معلوم ہے

نگاہِ یار سے نسبت بہت ضروری ہے
چُھری کی دھار سے نسبت بہت ضروری ہے

اداس گھر کے مکینوں سے جا کے کہہ دینا
درودیوار سے نسبت بہت ضروری ہے

میں ایک ایسے قبیلے کا فرد ہوں جس میں
سروں کی دار سے نسبت بہت ضروری ہے

زمین سونا اگلنے کی اہل ہے لیکن
زمین دار سے نسبت بہت ضروری ہے

ابھی کلی کے چٹکنے میں وقت باقی ہے
ابھی بہار سے نسبت بہت ضروری ہے

یہ ہار پھول یہ موتی ہیں خوشنما لیکن
گلوئے یار سے نسبت بہت ضروری ہے

بسا اوقات حفاظت کا کام دیتے ہیں
گُلوں کی خار سے نسبت بہت ضروری ہے

تم اپنی ذات میں کتنے بڑے بھی ہو شاہدؔ
تمہاری یار سے نسبت بہت ضروری ہے

جستجو شوق کے غنچوں کو کِھلا سکتی ہے
تیز بارش میں چراغوں کو جلا سکتی ہے

آپ یہ عشق سنبھالو گے کہ دستار میاں
آپ کے حصے میں رسوائی بھی آ سکتی ہے

میں تو اک پیڑ ہوں ہلنے کی اجازت بھی نہیں
تُو جو خوشبو ہے جہاں چاہے گی جا سکتی ہے

عین ممکن ہے ہواوں سے بچا لوں ان کو
تیز آندھی تو چراغوں کو بجھا سکتی ہے

دل کے کہسار پہ جو برف جمی رہتی ہے
یہ جو پگھلے گی تو طغیانی بھی آ سکتی ہے

پھول کے ساتھ ہی کانٹے بھی جواں ہوتے ہیں
رت بہاروں کی سہی زخم لگا سکتی ہے

زندگی شمع کی بجھتی ہوئی لَو ہے شاہدؔ
بجھتے بجھتے بھی جو خِرمن کو جلا سکتی ہے

ترے ، میرا خدا ہونے سے پہلے
برا کیا تھا بھلا ہونے سے پہلے

تو کیا سب لوگ بہرے تھے یہاں پر
تکلّم آشنا ہونے سے پہلے

جو پیلی گھاس کا ایندھن ہوا ہے
وہ جگنو تھا فنا ہونے سے پہلے

میری اک آنکھ سے قُربت رہی ہے
تمہارا ناخدا ہونے سے پہلے

کسی انکار میں ڈوبا ہوا تھا
میں حرفِ مُدعا ہونے سے پہلے

وفا کے باب بھی میں نے لکھے تھے
تمہارا بے وفا ہونے سے پہلے

سبھی منظر ہی دُھندلے پڑ گئے تھے
میں رویا تھا جدا ہونے سے پہلے

مرے شجرے سے تو واقف نہیں ہے
میں سورج تھا دیا ہونے سے پہلے

جبینِ ناز جھکتی جا رہی ہے
مرے سجدے قضا ہونے سے پہلے

مرا بھی نام تھا سخیوں میں شاہدؔ
کسی در کا گدا ہونے سے پہلے

اپنے بچوں کی طرح شوق سے پالے میں نے
درد جتنے بھی ملے سارے سنبھالے میں نے

نام ''تعبیر'' بتا رکھا ہے اُس لڑکی نے
اپنے سب خواب کئے جس کے حوالے میں نے

ہجر کی شام کہیں مار نہ ڈالے , ڈر ہے
آپ کے نام کے ساغر ہیں اچھالے میں نے

یاد کے جلتے چراغوں کی جبینیں چومیں
اپنے ہاتھوں پہ دھرے پاؤں کے چھالے میں نے

شعر کہتا رہا نظمیں بھی کہیں گیت لکھے
یاد کے سارے رجسٹر کیے کالے میں نے

چشمِ ساقی کی قسم مے کا کوئی شوق نہیں
بس کسی ہجر میں رکھے ہیں پیالے میں نے

سر کے بل رقص کیا ہاتھ میں گھنگھرو باندھے
سچ کہوں کام کیے سارے نرالے میں نے

آج پھر چیخ کے رونے کی تمنا جاگی
توڑ ڈالے ہیں سبھی ضبط کے تالے میں نے

دل کے معیار پہ لے آیا ہوں گھر کو شاہدؔ
اپنی مرضی سے اتارے نہیں جالے میں نے

بام و در پہ جڑی اداسی ہے
آج کتنی کڑی اداسی ہے

مجھ سے چھوٹی ہے عمر میں لیکن
مجھ سے قد میں بڑی اداسی ہے

پاوں جھٹکے ہیں جب رقّاصہ نے
گھنگروؤں سے جھڑی اداسی ہے

میں تو کہتا ہوں دو گھڑی ہنس لیں
اپنی ضِد پہ اڑی اداسی ہے

کیا اسے ساتھ لے لیا جائے
راستے میں کھڑی اداسی ہے

میں تری بات مان لوں لیکن
میرے پاوں پڑی اداسی ہے

زُلف زنجیر خُوشنما ہے مگر
اس کی پہلی کڑی اداسی ہے

ہر نظّارہ اداس ہے شاہدؔ
ہر نظر میں گڑی اداسی ہے

ہم صَد ہزار بار تجھے دیکھتے رہے
تھا شوق بے مہار تجھے دیکھتے رہے

کچھ نے تو مُسکرا کے کہا الوداع مگر
کچھ لوگ اشکبار تجھے دیکھتے رہے

پھر یوں ہوا کہ سارے بدن پر نکل پڑیں
آنکھیں کئی ہزار، تجھے دیکھتے رہے

دیوارِ جاں سے نقش تو تحلیل ہو گئے
مِژگاں کے آر پار تجھے دیکھتے رہے

اے حُسنِ لازوال تُو آیا جو بام پر
صدیوں کے بیقرار تجھے دیکھتے رہے

دیدہ ورانِ شوق نہ آنکھیں جھپک سکے
لمحوں کا کیا شمار ، تجھے دیکھتے رہے

یاروں نے میرے واسطے کیا کیا نہیں کِیا
لیکن مرا جو زخم تھا اچھا نہیں ہوا

بارش فضائے شہر کا کہرا نہ دھو سکی
اشکوں سے میری آنکھ کا جالا اتر گیا

پھر ایک چاند مر گیا سورج کی چاہ میں
جس کی تلاش تھی وہ اجالا نہ مل سکا

دیکھا تو مرے خانۂ دل میں مقیم تھا
میں آسماں کی وُسعتوں میں ڈھونڈتا رہا

کل رات اپنی آگ کی حِدّت سے جل اُٹھا
جو آسمانِ شوق کا تارا بنا رہا

شاہدؔ ہمارے ساتھ تھا شیشے کا آدمی
لیکن ہمیں تو ہر گھڑی دھڑکا لگا رہا

آنکھ سے آنکھ جب ملی ہو گی
وہ بڑی معتبر گھڑی ہو گی

گھر کی دہلیز جس نے چھوڑی ہے
جانے کس مول وہ بکی ہو گی

میری قسمت کی گُم شدہ دیوی
راستے میں کہیں کھڑی ہو گی

جس نے صحرا کی خاک چھانی ہے
اس کو کوئی تو بے کلی ہو گی

چاند تارے طواف کرتے ہیں
یہ یقیناً تری گلی ہو گی

تیرے ملنے کی ایک ساعت بھی
ہجر کی رات سے بڑی ہو گی

چاند کی بے ضیا کرن شاہدؔ
روشنی تجھ سے مانگتی ہو گی

تارے فلک سے توڑ کے لائے ابھی نہیں
وہ دعوے دار لوٹ کے آئے ابھی نہیں

کرتے رہے ہو عمر بھر زخموں کی دیکھ بھال
کچھ پھول بھی چمن میں کھلائے ابھی نہیں

چہرے کی ساری چاندنی بالوں میں آ گئی
جو قرض جان پر تھے چکائے ابھی نہیں

اس رشکِ ماہتاب نے آنا بھی ہے مگر
بام و در و دیوار سجائے ابھی نہیں

پھولوں کو ماند دیکھ کر بھنورے نے یہ کہا
اس کے لبوں سے رنگ چُرائے ابھی نہیں

میرے خدا نے مرے گناہوں کے باوجود
اپنے کرم کے ہاتھ اٹھائے ابھی نہیں

مرے ہُنر کا آج اجالا ہے چار سُو
حالانکہ سارے دیپ جلائے ابھی نہیں

شاہدؔ تمہاری اتنی جفاؤں کے بعد بھی
دشمن سے میں نے ہاتھ ملائے ابھی نہیں

اور کچھ بھی نہیں رہا باقی
دل ہے ٹوٹا ہوا بچا باقی

شہر کے سب مکاں مُقفّل ہیں
ایک میرا ہے در کھلا باقی

آبلے پوچھتے ہیں ہم سفرو
اور کتنا ہے راستہ باقی

آرزوؤں کے گُھپ اندھیرے میں
ایک کُٹیا ہے اک دیا باقی

نیند آنکھوں کی لے گیا کوئی
رہ گیا پاس رَت جگا باقی

کس قیامت کا سامنا ہے مجھے
رات کاٹی ہے دن کڑا باقی

تُو بھی ہم سے بچھڑ گیا شاہدؔ
اب نہیں کوئی آسرا باقی

پھولوں سے رنگ، رنگ سے خوشبو کشید کی
دیوارِ جاں پہ آپکی تصویر کھینچ دی

تقریبِ وصلِ یار پر، ہونٹوں کے جام سے
میں نے کہا کہ اور لا اُس نے کہا کہ پی

پھر یوں ہوا میں ہجر کی لذّت سے آشنا
جاتے ہوئے جو اس نے محبت سے بات کی

کل تذکرہء اہلِ محبت تھا بزم میں
سارے سُخنوروں نے ہماری ہی بات کی

کج بحثیءِ مزاجِ محبت سے بد گماں
دل ڈھونڈتا ہے اوّلیں ساعت کی دلکشی

شاہدؔ جو شخص شہر میں اڑیل مزاج تھا
اس نے ہماری بات سہولت سے مان لی

نامکمل ہی سہی پھر بھی کہانی سمجھو
اس کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کو نشانی سمجھو

تم اُجالے میں ملے ہو تو نئی بات کرو
رات کی بات کو اب بات پرانی سمجھو

کل یقیناً تری آنکھوں پہ لکھوں گا غزلیں
آج تو بات مری جان زبانی سمجھو

تم کو معلوم ہے سب درد کہانی پھر بھی
آنکھ سے بہتے ہوئے خون کو پانی سمجھو

میرے اشکوں کو فقط پانی سمجھ کر لوگو
اپنے صحرا کیلئے آب رسانی سمجھو

اگرچہ آنکھ مری اشکبار یوں بھی ہے
اک انتظار پسِ انتظار یوں بھی ہے

تجھے گماں کہ ترے ہجر کی بدولت ہے
مگر یہ دل تو مرا بے قرار یوں بھی ہے

مجھے تو خود ہی کسی روز ٹوٹ جانا ہے
مری رگوں میں تو اک اِنتشار یوں بھی ہے

مرے یقیں میں ہے مُضمِر سلامتی میری
تو اپنی ذات میں پروردگار یوں بھی ہے

یہ عشق یوں بھی زمانے سے چھپ نہیں سکتا
شریکِ رازِ محبت ہے یار یوں بھی ہے

ہوا کے ہاتھ سے پہلے تو بال و پر ٹوٹے
پھر ایک تیر لگا آر پار یوں بھی ہے

وہی جو رات کی نیندیں چُرانے والا ہے
وہی ہے وجہِ سکون و قرار یوں بھی ہے

ہوا تو روز کواڑوں کو کھٹکھٹاتی ہے
مگر ہے آج شبِ انتظار یوں بھی ہے

مزاج اپنا اذیّت پسند تھا شاہدؔ
سو راستے میں ملے خارزار یوں بھی ہے

تجھ کو پورا نہیں ملا ہوں میں
آدھا مجھ میں ہی رہ گیا ہوں میں

تیری محفل میں ذکر میرا ہے
یعنی اب بھی نہیں گیا ہوں میں

آئینے تِلملائے جاتے ہیں
اس قدر خُوش نما ہوا ہوں میں

اور کچھ وقت چاہیئے مجھ کو
اپنے بچوں کا آسرا ہوں میں

ایک قطرہ پلک پہ ٹھہرا ہوا
آدھی مانگی ہوئی دُعا ہوں میں

چاند ہوں اور چلتے پانی میں
دیکھ کیسا ٹھہر گیا ہوں میں

کوئی ایسے جُدا نہیں ہوتا
جیسے تجھ سے جُدا ہوا ہوں میں

کوئی چھت سے بلا رہا ہے مجھے
اور سیڑھی بنا رہا ہوں میں

دل کے اندر دہک رہا ہے کہیں
ایک آنسو جو پی چکا ہوں میں

کہہ دیا نا پرے رہو مجھ سے
کہہ دیا نا بہت بُرا ہوں میں

ایک مدت میں مسکرایا ہوں
تجھ کو اچھا نہیں لگا ہوں میں

موسمِ ہجر ہے مگر شاہدؔ
دیکھ کیسا ہرا بھرا ہوں میں

گوش بر دیوار ہے
کس قدر آزار ہے

چارہ گر ہے اِس طرف
اُس طرف بیمار ہے

تیر پیچھے سے لگے تو
دوستوں کا وار ہے

دائرہ در دائرہ
گُھومتی پرکار ہے

اس قدر اصرار ہے تو
جایئے انکار ہے

پھول جیسے ہاتھ میں
آج کل تلوار ہے

کوچہء دِلدار سے
دو قدم پر دار ہے

در بنانا چاہتا ہوں
سامنے دیوار ہے

لوٹتا پھر کون شاہدؔ
جو مزہ اس پار ہے

یہ ٹھیک ہے کہ محبت سزا بھی دیتی ہے
رُخِ حیات کو لیکن سجا بھی دیتی ہے

سڑک نہیں یہ جدائی کا استعارا ہے
مگر یہ بچھڑے ہوؤں کو ملا بھی دیتی ہے

ہوائے تیز کا یہ ہے کہ اپنی مستی میں
کئی سفینے کنارے لگا بھی دیتی ہے

نگاہِ شوق کا کاسہ اٹھا کے چلتے ہیں
سنا ہے وہ کبھی چلمن ہٹا بھی دیتی ہے

یہی ہوا کہ ضروری ہے زندگی کے لیے
یہی ہوا کہ دیئے کو بجھا بھی دیتی ہے

یہی زمین جو پیروں تلے ضروری ہے
یہی زمین کہ تلوے جلا بھی دیتی ہے

سنا ہے وہ مری غزلوں کو یاد رکھتی ہے
کبھی جو موج میں آئے تو گا بھی دیتی ہے

وداعی بوسہ جبیں پہ رقم کیا جائے
پھر اس کے بعد جدائی کا غم کیا جائے

میں بار بار جو سوتے میں چونک پڑتا ہوں
تمہارے خواب کا آنکھوں پہ دم کیا جائے

ندی کی تیز روانی سے پوچھنا یارو
کنارِ آب کو اشکوں سے نم کیا جائے!!!

ابھی بہار کے آنے میں وقت باقی ہے
ابھی تو دشت میں تھوڑا سا رَم کیا جائے

یہاں پہ قیس نے پہلا پڑاؤ ڈالا تھا
یہاں پہ لازمی گردن کو خم کیا جائے

ذرا سی دیر اندھیروں کا مان رکھتے ہیں
ذرا سی دیر چراغوں کو کم کیا جائے

ہمارے ہاتھ کٹانے سے کچھ نہیں ہوگا
ہماری سوچ کا سر ہی قلم کیا جائے

یہ اشک ہیں تو انہیں پی کے دیکھئے صاحب
یہ آگ ہے تو اسے دل میں ضم کیا جائے

ابھی تو آنکھ گلابی ہوئی نہیں شاہدؔ
ابھی تو ایک دو پیالہ بہم کیا جائے

عشق ناکام ہو گیا تو پھر
کوئی بدنام ہو گیا تو پھر

تو بچھڑنے کی بات کرتا ہے
تیرا یہ کام ہو گیا تو پھر

تم بھی سوچو کہ بیوفائی کا
سلسلہ عام ہو گیا تو پھر

میں تو مٹی ہوں اور خالص ہوں
تو اگر خام ہو گیا تو پھر

جو دیا طاق میں جلایا ہے
زینتِ بام ہو گیا تو پھر

اس نے تسلیم کر لیا مجھ کو
اور وہ رام ہو گیا تو پھر

اک قدم کا یہ فاصلہ شاہدؔ
بڑھ کے دو گام ہو گیا تو پھر

بیقراری سی بیقراری ہے
ہجر ہے اور پہلی باری ہے

اپنا بھی حوصلہ نہیں ٹوٹا
ان کی مشقِ سِتم بھی جاری ہے

ہجر کی ایک شب بھی مشکل ہے
ہم نے تو زندگی گزاری ہے

موت آنی ہے ایک بار مگر
خوف کیسا بدن پہ طاری ہے

کون جانے گا جیت سکتے تھے
ایک بازی جو ہم نے ھاری ہے

بڑھتے جاتے ہیں خوف کے سائے
بستیوں پہ ہراس طاری ہے

پُھوٹ ڈالی ہے میرے کُنبے میں
میرے دشمن کا وار کاری ہے

اب ذرا آئینے سے ہٹ جایئے
اب مرے دیکھنے کی باری ہے

مجھ سے دعوی ہے دوستی کا تجھے
میرے دشمن سے تیری یاری ہے

زندگی کی، اداس لمحوں سے
ایک مُدت سے جنگ جاری ہے

ہم ہی مجرم ہیں اس محبت کے
ساری غلطی فقط ہماری ہے

عشق مضموں ہے لازمی شاہدؔ
رہ گیا دین ، اختیاری ہے

حُسن کی سرکار تیرا شکریہ
اے مری دِلدار تیرا شکریہ

جسم میرا جل رہا تھا دھوپ میں
زلفِ سایہ دار تیرا شکریہ

کر دیا سرشار تیرے وصل نے
حسن ہائے یار تیرا شکریہ

مہرباں ہو کے ملا ہے آج وہ
ساعتِ اقرار تیرا شکریہ

معتبر مجھ کو زمانے میں کیا
مالک و مختار تیرا شکریہ

شیوہء ضبطِ سخن کو چھوڑ کر
اے لبِ اظہار تیرا شکریہ

منزلوں پہ بھی نہیں رُکنے دیا
گرمیٔ رفتار تیرا شکریہ

کارِ اُلفت میں کیا مصروف یوں
کر دیا بیکار، تیرا شکریہ

قافلے کو ''پار'' تو نے کر دیا
قافلہ سالار تیرا شکریہ

تُو نے مجھ کو اور اچھا کر دیا
اے دلِ بیمار تیرا شکریہ

کالی رُتوں کے زخم جو کھائے ہیں دوستو
تب جا کے چار پھول کھِلائے ہیں دوستو

کتنے ہی لوگ ظلم کی بھٹّی میں جل گئے
ماؤں نے کتنے لعل گنوائے ہیں دوستو

ہونٹوں پہ ضبطِ حال کے تالے پڑے رہے
دل نے اگرچہ حشر اٹھائے ہیں دوستو

ان رہبروں نے قوم کی خدمت کے نام پر
مال و متاع کے ڈھیر لگائے ہیں دوستو

میرے لئے تو یہ بھی قیامت سے کم نہیں
دشمن سے تم نے ہاتھ ملائے ہیں دوستو

اہلِ جنوں نے چاک محبت کے سی لئے
اہلِ ہوس نے ڈھونگ رچائے ہیں دوستو

مُنصف نے بادشاہوں کے کہنے پہ بارہا
کُوزہ گروں کے ہاتھ کٹائے ہیں دوستو

کتنے گھروں میں آج بھی ہے تیرگی کا راج
گھی کے چراغ تم نے جلائے ہیں دوستو

شاہدؔ فراقِ یار نے آنکھوں کو کھا لیا
یوں بھی کسی نے اشک بہائے ہیں دوستو

آنکھ کے جھپکنے میں دیر کتنی لگتی ہے
سامنے سے ہٹنے میں دیر کتنی لگتی ہے

چاند ماری کیجئے، ہاں مگر یہ سوچئے
تیر کو پلٹنے میں دیر کتنی لگتی ہے

جیت ہو گئی تو کیا بات بن گئی تو کیا
بات کو بگڑنے میں دیر کتنی لگتی ہے

دو گھڑی تو بیٹھیے بات چیت کیجئے
بات چیت کرنے میں دیر کتنی لگتی ہے

بازیاں تو کھیلی ہیں بازیاں تو کھیلیں گے
بازیاں پلٹنے میں دیر کتنی لگتی ہے

فاصلہ دو کمان تھا ہی نہیں
یعنی کچھ درمیان تھا ہی نہیں

جس کی تسخیر کا ارادہ تھا
وہ کبھی آسمان تھا ہی نہیں

تُو مجھے بھول بھی تو سکتا ہے
مجھ کو ایسا گُمان تھا ہی نہیں

خُوش گمانی بھی ٹھیک ہے لیکن
وہ کبھی مہربان تھا ہی نہیں

تیرے جیسی حسیں کوئی لڑکی
میرے جیسا جوان تھا ہی نہیں

تیری پہچان ہم بنے شاہدؔ
تیرا نام و نشان تھا ہی نہیں

اس کا چہرہ گیسوؤں کی زد میں ہے
چاند گویا بادلوں کی زد میں ہے

چھا گئی وحشت درودیوار پر
شہر جیسے جنگلوں کی زد میں ہے

دل مکاں کی خیر مانگو دوستو
یہ مسلسل بارشوں کی زد میں ہے

ایسا لگتا ہے زمیں سے دیکھ کر
جیسے سورج گردشوں کی زد میں ہے

زندگی اک دیپ ہے جلتا ہوا
ہر گھڑی جو آندھیوں کی زد میں ہے

وصل کی شب یوں لگا کہ اس کا دل
میرے دل کی دھڑکنوں کی زد میں ہے

ڈھلتا سورج دیکھ کر کہنا پڑا
روشنی بھی ظلمتوں کی زد میں ہے

باغباں ہے بے خبر اور آج پھر
سارا گلشن بجلیوں کی زد میں ہے

پہلے تو بے شمار سنوارا گیا مجھے
پھر آسماں سے نیچے اتارا گیا مجھے

جانے کی یوں تو مجھ کو اجازت بھی دی گئی
لیکن پلٹ پلٹ کے پکارا گیا مجھے

آنکھوں کو سبز خواب دکھانے سے پیشتر
کچھ روز رَت جگوں سے گزارا گیا مجھے

مٹی تو میری چاک پر رکھی نہیں گئی
دستِ ہُنر کے ساتھ اُسارا گیا مجھے

کچھ لوگ کہہ رہے ہیں شہیدِ وفا مجھے
کچھ لوگ کہہ رہے ہیں کہ مارا گیا مجھے

پہلے پہل تو صرف خسارا کیا گیا
پھر یوں ہوا کہ عشق دوبارا کیا گیا

ہونے لگا جو تذکرہ حُور و قصُور کا
اے خوش جمال ذکر تمہارا کیا گیا

بدلے ہوئے ہیں اس دفعہ گلشن کے ضابطے
شبنم کو آگ گل کو شرارا کیا گیا

کچھ روز یوں سکوں سے گزارے ہیں دوستو
کچھ روز آستیں سے کنارا کیا گیا

ویسے تو داستان کا عنوان ہم ہی تھے
لیکن طویل ذکر تمہارا کیا گیا

ٹوٹا ہوا وجود تھا گرتا ہوا مکان
اک دوسرے کا ان کو سہارا کیا گیا

سرِ محفل صدائے دل سنا کر دیکھ لیتے ہیں
چراغوں کو منڈیروں پر جلا کر دیکھ لیتے ہیں

دلِ برباد میں کچھ پل اُجالا ہو ہی جائیگا
تری تصویر تیرے خط جلا کر دیکھ لیتے ہیں

سُنا ہے وصل کا آزار بھی کچھ کم نہیں ہوتا
تمہیں ضِد ہے تو یہ صدمہ اٹھا کر دیکھ لیتے ہیں

تمہیں شکوہ ہے تم کو ٹھیک سے پرکھا نہیں ہم نے
چلو تم کو دوبارہ آزما کر دیکھ لیتے ہیں

بڑی بے تاب ہیں شاہدؔ یہ خواہش کی ابابیلیں
گھڑی پل کیلئے ان کو اُڑا کر دیکھ لیتے ہیں

اندھیرے میں برابر بولتا ہوں
دیا ہوں اور شب بھر بولتا ہوں

جہاں پر ذکر تیرا ہو رہا ہو
وہاں تو میں بھی فرفر بولتا ہوں

غموں کا ایک لمبا سلسلہ ہے
جنہیں دل میں چھپا کر بولتا ہوں

وہ میری پاس سے سنتا نہیں ہے
میں تھوڑی دور جا کر بولتا ہوں

مری آواز مجھ میں گونجتی ہے
میں گویا اپنے اندر بولتا ہوں

آئینوں کو پرے ہٹا دیجے
مجھ کو جانے کا راستہ دیجے

اب مجھے چاک سے اترنا ہے
کُوزہ گر کو ذرا بتا دیجے

ساعتِ دید گم نہ ہو جائے
آج چلمن ذرا اٹھا دیجے

رونے والوں کے پونچھئے آنسو
گرنے والوں کو آسرا دیجے

میٹھی میٹھی تو یاد رکھئے گا
تلخ یادیں مگر بھلا دیجے

ہجر لازم ہے اس محبت میں
رتجگوں کو ذرا بلا دیجے

آپ تو مجھ کو جانتے ہوں گے
مجھ کو مجھ سے ذرا ملا دیجے

نقش بگڑیں یا پھر بنیں شاہدؔ
آپ بس چاک کو گھما دیجے

صدمے ہزار جان پر ہنستے ہوئے سہے
ہم جُستجوئے یار میں بے مول بک گئے

جس وقت تیرے شہر میں قحطُ الرِجال تھا
اس وقت تیرے نام کی سُولی پہ ہم چڑھے

یونہی قبولِ عام کا درجہ نہیں ملا
دل کو لہُو کیا تو یہ شعروسخن ہوئے

لوگوں سے بات چیت بھی ہوتی رہی مگر
ہم ذات کے مُحیط سے باہر نہ آ سکے

چلمن ہٹا کے اپنے فقیروں کو بھیک دے
در پر کھڑے ہیں آنکھ کا کاسہ لئے ہوئے

راہِ وفا میں ہم بھی مُقلّد ہیں قیس کے
بستی کو چھوڑ چھاڑ کے جنگل میں آ بسے

آنکھیں تو ہم نے آپ کی چوکھٹ پہ گاڑ دیں
اور کچھ چراغ بامِ تمنا پہ رکھ دیے

لوگوں کی بات ٹھیک ہے لوگوں سے کیا گلہ
شاہدؔ ہمیں سے درد سنبھالے نہ جا سکے

کسی کو اپنا بنانے کی بات کی ہم نے
تمہارا ہجر منانے کی بات کی ہم نے

تمہارا ذکر کہیں بھی نہیں ہے شعروں میں
غزل میں سارے زمانے کی بات کی ہم نے

قدم قدم پہ محبت کے پھول کھلتے ہیں
نہیں نہیں وہ فسانے کی بات کی ہم نے

نگاہِ ناز ترا تذکرہ بھی آئے گا
اگر درُست نشانے کی بات کی ہم نے

تمہیں ہی ہم سے بچھڑنے کا شوق تھا شاہدؔ
کبھی بھی ہاتھ چھڑانے کی بات کی ہم نے ؟

زندگی سے اور ہو کتنی لڑائی معذرت
انتہائی معذرت ہے انتہائی معذرت

میں نے سوچا تھا کہ اس سے معذرت کر لوں مگر
پھر انا نے سر اٹھایا، لڑکھڑائی معذرت

میرے سب شکوے شکایت ایک پل میں ڈھل گئے
اُس کی نیلی آنکھ میں جب ڈبڈبائی معذرت

میں ترے چہرے سے مٹی جھاڑ سکتا ہوں مگر
میں کروں کیسے ترے دل کی صفائی معذرت

آنکھ کے جنگل میں شاہدؔ اُگ رہی ہیں جھاڑیاں
اور میرے خواب کے حصے میں آئی معذرت

دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے
جانے کس کی دہائی دیتی ہے

زندگی اپنے قید خانے سے
دیکھئے کب رہائی دیتی ہے

رات کے مخملیں اندھیرے میں
تیری صورت دکھائی دیتی ہے

جب وہ بولے تو پھول جھڑتے ہیں
اور خوشبو سنائی دیتی ہے

زندگی کا خراج دے دیں تو
یہ بھی اپنی کمائی دیتی ہے

میرے مولا کی مہربانی ہے
ورنہ عزت ، خدائی دیتی ہے!

دل کی اپنی دلیل ہے شاہدؔ
آنکھ اپنی صفائی دیتی ہے

کوئی منظر بھلا نہیں لگتا
آشنا، آشنا نہیں لگتا

آرزوؤں کے زرد لاشے پر
زخم کوئی ہرا نہیں لگتا

طاقِ نسیاں کی نذر کر ڈالے
اس قدر بے وفا نہیں لگتا

اس میں آزار کس قدر کم ہے
زخم تیرا دیا نہیں لگتا

کیا مری موت ہو گئی لوگو
کچھ بھی اچھا برا نہیں لگتا

جس پہ چل کر نجات ہو جائے
مجھ کو یہ راستہ نہیں لگتا

اب جوانی گزر گئی شاہدؔ
تیرا جانا برا نہیں لگتا

آندھیوں نے بجھا دیا ہے دیا
ہم نے پھر سے جلا دیا ہے دیا

اس نے آنا نہیں مگر ہم نے
احتیاطاً جلا دیا ہے دیا

جس نے جانا ہو وہ چلا جائے
اہتماماً بجھا دیا ہے دیا

قتل کرنا ہے سب اندھیروں کو
تیرگی سے لڑا دیا ہے دیا

روشنی دور تک چلی جائے
یعنی پرچم بنا دیا ہے دیا

آگ دریا میں لگ نہیں سکتی
میں نے اس میں بہا دیا ہے دیا

جو ہواؤں سے بجھنے والا تھا
میں نے سُولی چڑھا دیا ہے دیا

اُس کے آتے ہی میرِ محفل نے
پُھونک ماری بجھا دیا ہے دیا

لَو بڑھانے کی بات تھی شاہدؔ
ہم نے آگے بڑھا دیا ہے دیا

عنوان بے مثال روانی غضب کی ہے
کردار کہہ رہے ہیں کہانی غضب کی ہے

جگنُو تمہاری یاد کے مٹھی میں آ گئے
دیکھو تو آج رات سہانی غضب کی ہے

دن بھر چمن پہ لال گلابوں کا راج تھا
اب رات ہے تو رات کی رانی غضب کی ہے

آنچل کا ایک تار جو تو نے دیا ہمیں
اے شوخ تیری یہ بھی نشانی غضب کی ہے

خود کو خریدنے کی بھی سکت نہیں رہی
بازارِ زندگی میں گرانی غضب کی ہے

ساقی نئی شراب بھی خاصے کی چیز ہے
پر تیرے میکدے کی پرانی غضب کی ہے

وہ خُوش خرام میرے خیالوں میں آ گئی
اس واسطے غزل پہ روانی غضب کی ہے

مُسکرانے میں کیا قباحت تھی
حظ اٹھانے میں کیا قباحت تھی

دور جانے میں کیا بھلائی تھی
پاس آنے میں کیا قباحت تھی

سب اشارے بلیغ تھے لیکن
لب ہلانے میں کیا قباحت تھی

یاد رکھنا بری بلا ہے اگر
بھول جانے میں کیا قباحت تھی

رات کا حوصلہ بڑھانے کو
دل جلانے میں کیا قباحت تھی

دوسری بار اپنے یاروں کو
آزمانے میں کیا قباحت تھی

آنے جانے سے کیا بگڑ جاتا
آنے جانے میں کیا قباحت تھی

اِس زمانے کی بات کرتی ہو
اُس زمانے میں کیا قباحت تھی

اب جو پھرتے ہو دربدر شاہدؔ
آشیانے میں کیا قباحت تھی

اپنی پہچان یوں کرا لیں گے
آپ کو واسطہ بنا لیں گے

تو کبھی جھٹپٹے میں مل آ کر
تیری مشکل کا حل نکالیں گے

وصل کی آرزو تو ہے لیکن
ہم ترا ہجر بھی منا لیں گے

چاندنی کھیلنے کو نکلی تو
چاند کو حالِ دل سنا لیں گے

کل نئی منزلوں کو جانا ہے
کل نیا راستہ نکالیں گے

ساقیا تو پلائے جا پیہم
گرنے والوں کو ہم سنبھالیں گے

آپ کہتے ہیں اِک رکاوٹ ہے
اِک رکاوٹ تو ہم ہٹا لیں گے

اے مرے ہمسفر محبت میں
ہم ترا بوجھ بھی اٹھا لیں گے

آیئے بات کیجئے شاہدؔ
بات بگڑی تو ہم سنبھالیں گے

دنیا بڑی خراب ہے میں نے کہا تو تھا
جینا یہاں عذاب ہے میں نے کہا تو تھا

آئے گا وہ خیال کے گھوڑے پہ بیٹھ کر
جو شخص ایک خواب ہے میں نے کہا تو تھا

جو دستاویز امن کی خاطر لکھی گئی
وحشت کا ایک باب ہے میں نے کہا تو تھا

اوروں کے ساتھ تجھ کو بھی برباد کر گیا
ظالم ترا شباب ہے میں نے کہا تو تھا

نظروں کی تیز آنچ ہی کر دے گی اسکو راکھ
یہ جو ترا نقاب ہے میں نے کہا تو تھا

قدموں میں اپنے دیکھ ستارے جھکے ہوئے
تو رشک ماہتاب ہے میں نے کہا تو تھا

شاہدؔ تجھے یہ خون کے آنسو رُلائے گا
جو تیرا انتخاب ہے میں نے کہا تو تھا

وہ صبح رات کے دامن سے جب نکل آئی
میں جست بھر کے ترے آسماں کو چھو آئی

سَنی ہوئی ہیں لہو سے ہتھیلیاں میری
تمہارے واسطے کچھ پھول تو میں لے آئی

دیا سلائی میسر نہ ہو سکی کل شب
سو تیرے نام کی شمعیں نہیں جلا پائی

نواحِ شام، اداسی بہت ہی گہری تھی
ڈھلی جو رات تو بجنے لگی ہے شہنائی

تمہاری یاد کا جنگل گھنا تو تھا شاہدؔ
وہ حبس تھا کہ میں سانس بھی نہ لے پائی

وقت کو یوں کڑی سزا دیتا
میں اسے بھی گھڑی دلا دیتا

کاش مجھ کو بھی، بھولنے والا
بھول جانے کا گُر بتا دیتا

اپنی سانسیں بھی سونپ دیں اس کو
میں بھلا اس کو اور کیا دیتا

اک دیا طاق میں جلایا تھا
اک دیا بام پر جلا دیتا

کیسا بے چہرگی کا عالم تھا
میں اگر چاک نہ گھُما دیتا

خال و خد کو سنوار کر شاہدؔ
تو مجھے آئینہ بھی لا دیتا

درد آزار سے پرے کچھ ہے
رنگ رُخسار سے پرے کچھ ہے

تشنگی کہہ رہی ہے آنکھوں کی
تیرے دیدار سے پرے کچھ ہے

تیرے رُخسار یوں دمکتے ہیں
گویا انکار سے پرے کچھ ہے

میرے رقّاص کو خبر کرنا
رقص رفتار سے پرے کچھ ہے

ایک مدت کے بعد سمجھا ہوں
عشق اظہار سے پرے کچھ ہے

روشنی کس طرف سے آتی ہے
کوچہء یار سے پرے کچھ ہے

اے مرے قد کو جانچنے والے
تیرے معیار سے پرے کچھ ہے

ان کے بدلے بہشت ملتا ہے
یعنی اشجار سے پرے کچھ ہے

تم سمجھتے ہو غار، غار ہے بس
مومنو! غار سے پرے کچھ ہے

دست و بازو بھی ڈھالنے ہوں گے
وار، تلوار سے پرے کچھ ہے

یونہی کیا دار چڑھتے جاتے ہیں
قاضیا! دار سے پرے کچھ ہے

یار سب کوچ کرتے جاتے ہیں
اس چمن زار سے پرے کچھ ہے

میں تو ہارا ہوں جان کر شاہدؔ
میری اس ہار سے پرے کچھ ہے

مُردار رواجوں کے ٹھٹھرتے ہوئے سائے
بیٹھے ہیں کئی لوگ دوکانوں پہ سجائے

منہ زور ہواؤں کا تماشہ بھی تو دیکھیں
ہم اپنے چراغوں کو در و بام پہ لے آئے

میدان میں لے آئے سبھی تیر و تفنگ اپنے
دشمن ہے تو اب کُھل کے مرے سامنے آئے

اس آس پہ آنکھوں کو یہیں چھوڑ چلا ہوں
ممکن ہے کسی روز وہ چلمن کو ہٹائے

تقریبِ ملاقات کا امکان بھی تھا لیکن
ہم خود ہی سرابوں کے تعاقب میں چلے آئے

اب بزمِ طُرب دل کو گوارہ نہیں شاہدؔ
وہ جائے کسی اور کی محفل کو سجائے

دوستو یہ اٹھان ٹھیک نہیں
اتنی اونچی اڑان ٹھیک نہیں

آج محفل میں کچھ نہیں کہنا
آج میری زبان ٹھیک نہیں

ہجر سے وصل جوڑ دیتے ہو
یہ کڑا امتحان ٹھیک نہیں

میں اسے چاک پر چڑھاؤں گا
یہ ترا خاکدان ٹھیک نہیں

روز میری زمیں سے ملتا ہے
خالقا ! آسمان ٹھیک نہیں

سارے کردار نامکمل ہیں
آپ کی داستان ٹھیک نہیں

یعنی ہر شخص میں خرابی ہے
یعنی سارا جہان ٹھیک نہیں

دل میں آسیب گھر بنا لے گا
یونہی خالی مکان ٹھیک نہیں

یا کوئی دھوپ میں خرابی ہے
یا ترا سائبان ٹھیک نہیں

سُنیے شاہدؔ ہمارے بارے میں
ایسے ویسے گمان ٹھیک نہیں

بجھنے لگے سراب
لَو دے رہے ہیں خواب

میں اک دیے کی لو
تُو مثلِ آفتاب

چھوٹی سی ایک بھول
اتنا بڑا عذاب

کُھلنے لگے وہ ہونٹ
جھڑنے لگے گلاب

سالوں پہ ہے محیط
لمحوں کا یہ عذاب

دہکے ہوئے وہ گال
جلتا ہوا نقاب

ساقی ہوئے جو آپ
چلتی رہی شراب

اپنی وفا کے نام
شاہدؔ یہ انتساب

دل زیادہ دھڑک رہا ہے میاں
یہ محبت کی ابتدا ہے میاں

ہم کو اڑیل مزاج کہتے ہو
بدزبانی کی انتہا ہے میاں

میں جو محتاط لگ رہا ہوں تجھے
یہ مرا عشق دوسرا ہے میاں

میں کراچی ہوں وہ میانوالی
یہ ذرا سا تو فاصلہ ہے میاں

شہر کے مُفتیوں سے کہہ دینا
عشق بھی ایک سر پھرا ہے میاں

جانے والوں سے کچھ بھی مت کہیئے
جانے والوں کا مسئلہ ہے میاں

ہم کو اپنی خبر نہیں شاہدؔ
کوئی اچھا ہے یا برا ہے میاں

ناصر کاظمی کی نذر

خواب در خواب جھانکتی ہے ابھی
زندگی سانس لے رہی ہے ابھی

اس کی آنکھیں اداس ہیں لیکن
اس کے چہرے پہ تازگی ہے ابھی

ایک منظر نظر نے دیکھا ہے
چوٹ دل پہ نہیں لگی ہے ابھی

ریل گاڑی تو جا چکی ہے مگر
ریل پٹڑی وہیں بچھی ہے ابھی

یا تو تحریر ہی شکستہ ہے
یا میری آنکھ میں نمی ہے ابھی

میں بھی کہتا ہوں نامکمل ہوں
وہ بھی کہتا ہے کچھ کمی ہے ابھی

کار والا چلا گیا لیکن
اور لڑکی وہیں کھڑی ہے ابھی

عشق کا مرحلہ بھی آئے گا
یہ تعلق تو دوستی ہے ابھی

ایک کھڑکی تو بند ہے شاہدؔ
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

ہماری اَور بھی اب ان کا دھیان آیا ہے
امیرِ شہر کا تازہ بیان آیا ہے

کہیں وفاؤں کے موتی نہیں ملے اس کو
وہ خاک شہرِ محبت کی چھان آیا ہے

تجھے ہی زیب ہیں ساری بلندیاں لیکن
زمیں سے ملنے ترا آسمان آیا ہے

وہ پار سال بھی مرنے کی بات کرتا تھا
وہ لے کے اب بھی یہی داستان آیا ہے

اِک آدھ چیز یہاں سے نہیں ملے گی تمہیں
وہ آج بیچنے ساری دکان آیا ہے

پھر آج رِزق کشادہ کیا گیا میرا
پھر آج گھر میں مرے میہمان آیا ہے

فلک نے جب بھی گرائی ہیں بجلیاں شاہدؔ
بس ان کی زد میں ہمارا مکان آیا ہے

کچے گھڑے پہ پار جو جانا پڑا مجھے
دریا کو ایک ہاتھ دکھانا پڑا مجھے

چارہ گروں کی چارہ گری دیکھتے ہوئے
چارہ گروں سے زخم چھپانا پڑا مجھے

تیشہ بدست دیکھ کے دشمن جو ڈر گئے
پھر خالی ہاتھ سامنے آنا پڑا مجھے

تیری کرشمہ کار طبیعت کے باوصف
بازی گروں کو دوست بنانا پڑا مجھے

کل رات اس کی بولتی آنکھوں کو دیکھ کر
جانا پڑا نہ لوٹ کے آنا پڑا مجھے

مال و متاع تو خیر دل و جاں چلے گئے
مہنگا تمہارے شہر ٹھکانہ پڑا مجھے

اس زندگی سے اتنی محبت کے باوجود
کل رات اس پہ ہاتھ اٹھانا پڑا مجھے

اُس شوخ دید باز کو لوگوں کے سامنے
چٹکی بجا کے ہوش میں لانا پڑا مجھے

تاروں سے اپنا پیار جتانے کے واسطے
شاہدؔ فلک زمین پہ لانا پڑا مجھے

یاروں کو تو اس بات کا ادراک نہیں ہے
دھرتی سا تماشا سرِ افلاک نہیں ہے

دریا کے کنارے کی طرح آنکھ ہے میری
یہ تیری جدائی میں تو نمناک نہیں ہے

پیوند لگے کپڑے مرے اپنے ہیں صاحب
یہ آپ کی اتری ہوئی پوشاک نہیں ہے

محفل میں کہی بات سرِ دار بھی کہہ ڈالے
بے باک ترا اتنا بھی بے باک نہیں ہے

غازہ ہے مُسافت کا مرے چہرے پہ شاہدؔ
تم خاک سمجھ بیٹھے ارے خاک نہیں ہے

کومل کومل جذبوں کی توہین ہوئی ہے
اُجلے تن پہ بدنامی کا داغ لگا ہے

آؤ غم کو آدھا آدھا بانٹ کے دیکھیں
تنہا سہنے سے تو یہ غم اور بڑھا ہے

سکھ کی دولت قسمت والوں کو ملتی ہے
دکھ کا سونا سب کے گھر میں ڈھیر پڑا ہے

مجھ کو دنیا والوں کا کچھ خوف نہیں
ڈر تو مولا تیرا ہے تو دیکھ رہا ہے

میں نے کانٹوں کے بدلے میں پھول دیے ہیں
اور خوشی سے کانٹوں کا ہر زخم سہا ہے

درد میرے ضبط سے کچھ کچھ سوا پہلے بھی تھا
تو ابھی بچھڑا نہ تھا لیکن جدا پہلے بھی تھا

کیوں بھلا پھر درد کی سوغات مجھ کو دے گیا
آنسوؤں کا تو مجھے کچھ آسرا پہلے بھی تھا

وقت آنے پر مجھے پہچان سب کی ہو گئی
گو میں اپنے دوستوں کو جانتا پہلے بھی تھا

تم سمجھتے ہو محبت ایک پل میں مر گئی
دو دلوں کے درمیاں کچھ فاصلہ پہلے بھی تھا

موسمِ ہجراں نے بخشی سوز کی دولت مجھے
میں اگرچہ دردِ دل سے آشنا پہلے بھی تھا

ناؤ ڈوبی ہے تو اس کے اور ہی اسباب تھے
ناخدا جو آج ہے وہ ناخدا پہلے بھی تھا

آج کا جھگڑا جدائی کا بہانہ بن گیا
چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا سلسلہ پہلے بھی تھا

تُو ملا تو یوں لگا سوچیں مجسم ہو گئیں
تُو نہیں تھا تو تجھے میں سوچتا پہلے بھی تھا

آج تیرا ساتھ ہے تو اور ہی ماحول ہے
ورنہ تو یہ رت جگوں کا سلسلہ پہلے بھی تھا

ہجر بادل ٹوٹ کر برسا قیامت آ گئی
درد کی طغیانیوں کا سلسلہ پہلے بھی تھا

جگنوؤں کے قافلے تو آج اترے ہیں مگر
طاقچے میں اک دیا جلتا ہوا پہلے بھی تھا

غیر سے ملنا تو شاہدؔ اک بہانہ بن گیا
اپنے اندر سے وہ ظالم بے وفا پہلے بھی تھا

فیض احمد فیض کی برسی کے موقع پر

ان کی زمین میں چند اشعار

کچھ اور بھی ظلمت کو بڑھا کیوں نہیں دیتے
اِن چاند ستاروں کو بجھا کیوں نہیں دیتے

جب صاحبِ منصب کا طرفدار ہے قاضی
منصور کو سُولی پہ چڑھا کیوں نہیں دیتے

اب جائے کسی اور کی دیوار پہ بیٹھے
تم آس کے پنچھی کو اُڑا کیوں نہیں دیتے

بادل ہو تو دھرتی پہ مری ٹوٹ کے برسو
بجلی ہو تو خرمن کو جلا کیوں نہیں دیتے

کلیوں کو چٹک جانے کے اطوار سکھاؤ
پھولوں کو مہکنے کی ادا کیوں نہیں دیتے

مکتوب ترے میں نے جلا ڈالے ہیں شاہدؔ
تصویر مری تم بھی جلا کیوں نہیں دیتے

گلشن میں ہیں اب سرو و سمن اور طرح کے
اپنے بھی ہیں کچھ یارو چلن اور طرح کے

آنکھوں سے نہیں قتل وہ خنجر سے کریں گے
اس دور میں ہوتے ہیں سجن اور طرح کے

اُس پار سنا ہے کہ خزائیں نہیں آتیں
اس پار کے ہوتے ہیں چمن اور طرح کے

اب جسم نہیں رُوح کو مصلُوب کریں گے
ایجاد ہوئے دار و رسن اور طرح کے

لاکھوں میں بھی ممتاز نظر آتا ہے شاہدؔ
چَھب اور طرح کی ہے پھبن اور طرح کے

شکوے گلے کو یار مٹانے کی بات کر
روٹھے ہوئے کو آج منانے کی بات کر

آؤ گلے سے لگ کے مٹائیں یہ دوریاں
نفرت کی ہر دیوار گرانے کی بات کر

اس خامشی میں گُھٹ کے کہیں مر نہ جائیں ہم
اپنی نہیں تو کوئی زمانے کی بات کر

میں آئینہ ہوں ٹوٹ بھی سکتا ہوں میرے یار
مقدُور بھر تو مجھ کو بچانے کی بات کر

نہ جانے کس نے خارِ مغیلاں بچھا دیئے
راہِ وفا میں پھول کھلانے کی بات کر

قدموں کو چوم لیں گی ترے کامرانیاں
تو کشتیوں کو آگ لگانے کی بات کر

مجبوریوں کی بات تو سُننی نہیں مجھے
وعدہ کیا تو وعدہ نبھانے کی بات کر

آپ گُلشن میں جب گئے ہوں گے
پھول قدموں میں گر پڑے ہوں گے

سارا منظر ہی بُجھ گیا ہو گا
آپ منظر پہ چھا گئے ہوں گے

چارہ گر نے لبوں کو سی ڈالا
ورنہ یہ زخم بولتے ہوں گے

لاش پھینکی ہے سامنے گھر کے
یعنی قاتل تھے جو بھلے ہوں گے

لالی کاجل تو ہو گا کمرے میں
آئینے صحن میں دھرے ہوں گے

اس دفعہ خود ہی قافلے والے
اپنے رہزن سے جا ملے ہوں گے

جن کی آنکھیں ہیں نیم وا شاہدؔ
راہ تکتے ہوئے مرے ہوں گے

ڈوبتے چاند کچھ بتا اُن کا
دیپ روشن ہے یا بجھا ان کا

جن کے ہونٹوں پہ پھول کھلتے تھے
اب بھی گلشن ہے کیا ہرا ان کا

دیکھنے میں تو خوبصورت تھے
بات کی تو پتہ چلا اُن کا

سُرمئی شام کپکپانے لگی
یعنی آنچل ڈھلک گیا اُن کا

آنکھوں آنکھوں میں بات ہوتی ہے
روز ہوتا ہے سامنا ان کا

خواب ان کے خیال بھی ان کے
نیند ان کی ہے رَت جگا ان کا

ہم نے آنکھوں کو خواب سونپے تھے
اِن سے پوچھو کہ کیا بنا اُن کا

حسرتیں بین کرتی پھرتی ہیں
آج پھر کوئی مر گیا ان کا

اپنے دل سے کھرونچ ڈالا ہے
ہم نے سارا کہا سنا ان کا

پھول چُھو کر انہیں کِھلے شاہدؔ
رنگ پھولوں سے تھا سوا اُن کا

چراغِ شب ہوں کسی لو سے ملنے والا ہوں
میں آج رات بہرطور جلنے والا ہوں

وصالِ یار کوئی دن ابھی توقف ہو
ابھی میں ایک جھلک سے بہلنے والا ہوں

تمہارے دیدہءحیراں کی تازگی کے لئے
تمہارے سامنے منظر بدلنے والا ہوں

میں خار بن کے کھٹکتا ہوں تیری آنکھوں میں
میں تیری آنکھ کے اندر ہی پلنے والا ہوں

ہے سجدہ گاہِ محبت کا احترام ، مگر
میں اس مقام سے آگے نکلنے والا ہوں

کبھی میں رات گئے تک چمکتا رہتا ہوں
کبھی میں شام سے پہلے ہی ڈھلنے والا ہوں

تمہاری آنکھ کی حِدّت نے شل کیا شاہدؔ
میں عشق زاد تھا لیکن پگھلنے والا ہوں

ناخدا کا ہے کچھ سہارا بھی
پاس کشتی بھی ہے کنارا بھی

عشق کا اعتبار کیا کیجے
یہ تو شبنم بھی ہے شرارا بھی

بعد میں فون کال کی اس کو
پہلے جاتے ہوئے پکارا بھی

زندگی راس تُو نہیں آئی
قرض تیرا بہت اتارا بھی

تیرے قدموں میں ڈالنے کیلئے
چاند جگنُو بھی ہے ستارا بھی

ہم علامت ہیں حسن کی یارو
اور محبت کا استعارہ بھی

کچھ منافع ہے کارِ اُلفت میں
اور ہوتا ہے کچھ خسارا بھی

گھر کو برباد کیوں کریں شاہدؔ
گھر تمہارا بھی ہے ہمارا بھی

بھٹک نہ جائے کہیں کاروان رستے میں
میں چھوڑ آیا ہوں اپنا نشان رستے میں

ضرور ڈوبتے سورج کو ڈھونڈ لاتا میں
اگر نہ پڑتا تمہارا مکان رستے میں

جبھی تو آ کے مرے پاؤں پڑ گئی منزل
گنوا کے آیا ہوں دونوں جہان رستے میں

چراغ یوں بھی بجھائے نہیں ہیں گلیوں کے
کہاں پھرے گی ہوا بے نشان رستے میں

تمہارے حُسنِ سماعت پہ جاں فدا ہے مگر
کھڑا ہوا ہے کوئی بے زبان رستے میں

دیکھ کے تیری چال روانی بھول گیا
دریا اپنی شوخ جوانی بھول گیا

لگتا ہے زنجیر کہیں سے ٹوٹ گئی
کہتے کہتے یار کہانی بھول گیا

آخر اس کے ہاتھ کی مہندی ماند پڑی
آخر میں بھی ''پیڑ'' پرانی بھول گیا

وہ بھی اپنا دن کا راجہ کھو بیٹھی ہے
میں بھی اپنی رات کی رانی بھول گیا

کچھ نمکین لکیریں رہ گئیں گالوں پر
آنکھ سے بہتا نیلا پانی بھول گیا

اس دن شاہدؔ اس کے لب بھی کانپ رہے تھے
میں بھی اپنی بات سنانی بھول گیا

احمد فراز کے یوم وفات پر

ستارے بامِ فلک سے اُتر کے دیکھتے ہیں
زمین زاد تجھے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے منزلیں تم پر تمام ہوتی ہیں
سنا ہے قافلے تجھ کو ٹھہر کے دیکھتے ہیں

ترا جمال گُلستاں میں یوں مہکتا ہے
گلاب شاخ سے نیچے اتر کے دیکھتے ہیں

ہوائے شوخ سے جب ڈالیاں لچکتی ہیں
تو ہم بھی زاویے تیری کمر کے دیکھتے ہیں

ابھی تو آنکھ بھی کھولی نہیں ہے جذبوں نے
ابھی سے خواب ترے بام و در کے دیکھتے ہیں

ہوا کے ہاتھ میں دیکھو تو زرد پتے ہیں
اجاڑ راستے تیرے نگر کے دیکھتے ہیں

یہاں کے دشت نوردوں کا المیہ یہ ہے
ہمیشہ خواب سہانے سفر کے دیکھتے ہیں

سنا ہے وہ بھی دلوں کا علاج کرتا ہے
''یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں''

کئی دنوں سے جلایا ہے طاق میں اس کو
دیے کو آج منڈیروں پہ دھر کے دیکھتے ہیں

کمالِ حسن یا حسنِ کمال ہے شاہدؔ
کہ آئینے بھی تجھے سج سنور کے دیکھتے ہیں

یوں تو ہر چیز آنی جانی ہے
بس ترا ذکر جاودانی ہے

یہ نہ ہوتی تو مر گیا ہوتا
شاعری خون کی روانی ہے

اک محبت ہے اک تعلق ہے
اک فسانہ ہے اک کہانی ہے

آنکھ سے دل کا کیا تعلق ہے
ایک شعلہ ہے ایک پانی ہے

آخری خط جلا رہا ہوں میں
یہ تری آخری نشانی ہے

گھر میں رہ کر بھی گھر سے باہر ہوں
لامکانی سی لامکانی ہے

دھڑکنیں معتدل رہیں کیسے
ہر گھڑی کوئی ناگہانی ہے

حاکمِ وقت ہیں یہ دونوں ہی
دن ہے راجہ تو رات رانی ہے

فیضؔ سے فیض میں نے پایا ہے
میرے شعروں میں جو روانی ہے

تجھ سے ہر بار ہار جاتا ہوں
کامرانی سی کامرانی ہے

کچھ تو عاشق مزاج تھے شاہدؔ
کچھ تمہاری بھی مہربانی ہے

پھول کانٹے اور سارے شاخچے اچھے لگے
ہم سفر وہ ہو گیا تو راستے اچھے لگے

مجھ کو میرے یار کی جب سے رفاقت مل گئی
راستے کے پیچ و خم اور دائرے اچھے لگے

دھوپ میں گوری نے اپنے بال کھولے جس گھڑی
گیسوؤں کے خم کمر کے زاویے اچھے لگے

ایک دن دو اجنبی آنکھیں اسے تکتی رہیں
ایک دن اس نازنیں کو آئینے اچھے لگے

آنے والے زلزلے کی دے رہے تھے وہ خبر
اس لئے اس روز کتے بھونکتے اچھے لگے

نہ کسی کا نام تھا اور نہ کوئی پہچان تھی
شہر کی اندھی گلی کے ضابطے اچھے لگے

ایک شہزادی نے جب فٹ پاتھ پہ رکھا قدم
آسمانوں کے زمیں سے رابطے اچھے لگے

سانحوں سے اس قدر مانوس ہیں بستی کے لوگ
جب ذرا ''چھوٹے'' ہوئے تو سانحے اچھے لگے

سر پہ دھر دستِ دعا دوست مجھے جانے دے
اے مرے بخت رسا دوست مجھے جانے دے

میں نے بھرپور تجلّی کو سراہا پہلے
پھر جو گھبرا کے کہا دوست مجھے جانے دے

آخری بار مرے ہاتھ پہ بوسہ دے کر
ہاتھ سے ہاتھ ہٹا دوست مجھے جانے دے

پیچ در پیچ نہ کُھل جائے کہیں عُجلت میں
میری دستارِ انا دوست مجھے جانے دے

مجھ کو اب اور محبت کی ضرورت ہی نہیں
اب نہ کر مجھ سے وفا دوست مجھے جانے دے

تم ذرا ایک طرف ہو کے کھڑے ہو جانا
میں ہی سہہ لوں گا سزا دوست مجھے جانے دے

کتنی صدیوں سے مجھے دیکھ رہا ہے شاہدؔ
دیکھ وہ دُور خلا دوست مجھے جانے دے

تصویرِ یار ہم نے جلانی تو ہے نہیں
لیکن اسے یہ بات بتانی تو ہے نہیں

وہ خواب ہے تو شب میں اسے دیکھئے حضور
ہے دیکھنے کی چیز اٹھانی تو ہے نہیں

ہم مصر کے بازار میں آئے ہیں دوستو
قیمت کسی بھی شئے کی لگانی تو ہے نہیں

ترکِ تعلقات کی ٹھانی ہے اس لئے
جھگڑے کی بات اور بڑھانی تو ہے نہیں

ہم روشنی کے واسطے شمعیں جلائیں گے
گھر میں کسی کے آگ لگانی تو ہے نہیں

مٹی تو گُوندھنی ہے مگر اس دفعہ مجھے
انسان جیسی چیز بنانی تو ہے نہیں

حسنِ بیداد گر سلیقے سے
ہم پہ الزام دھر سلیقے سے

لوگ آزاد ہی سمجھتے ہیں
اُس نے باندھے ہیں پَر سلیقے سے

میں تو دریا ہوں صاف پانی کا
اپنی گاگر کو بھر سلیقے سے

میں نے دامن کو چاک کرنا ہے
مجھ کو آزاد کر سلیقے سے

خوبصورت جواب ملتے ہیں
کوئی پوچھے اگر سلیقے سے

آگے کتنے سراب آئیں گے
دشت آنکھوں میں بھر سلیقے سے

کوئی شکوہ گلہ کیا ہی نہیں
اُس کو چھوڑا مگر سلیقے سے

خُوش ادائی سے حُسن کو برتا
جب بھی ڈالی نظر سلیقے سے

ہم مرے تو ہمارے مرنے کی
اُس کو دینا خبر سلیقے سے

ایک در ہی نہ جب کُھلا شاہدؔ
ہو گئے در بدر سلیقے سے

---تمت بالخیر---